دیوان



شیخ شوکت علی اینڈ سنز
بندر روڈ - کراچی

دیوانِ غالب

نجم الدولہ دبیر الملک

نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب

شیخ شوکت علی اینڈ سنز

ناشران و تاجرانِ کتب بندر روڈ کراچی

باہتمام

بلقیس اقبال

پروپرائیٹر

شیخ شوکت علی اینڈ سنز

کراچی

(مطبوعہ: انجمن پریس کراچی)

اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا!

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی، دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے

مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بس کہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

(۲)

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا، مگر، بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا
آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سُود تھا
لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا، اور بود تھا
ڈھانپا کفن نے داغِ عیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

(۳)

کہتے ہو نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مدعا پایا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

دوست دارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

سادگی و پُرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا، تم نے بارہا پایا

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

۴

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دل نہیں، تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

۵

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا

بوئے گل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا بقدرِ لبِ دنداں نکلا

تھی نوآموز فنا ہمّتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ
آہ، جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

(۶)

دھمکی میں مر گیا، جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

دل تا جگر، کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل، آگے گرد تھا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال، بیاباں نورد تھا

یہ لاشِ بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(۷)

شمارِ سبحہ، مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

بہ فیضِ بے دلی، نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل، آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مبارک باد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

(۸)

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفَس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی
گوش منّت کشِ گلبانگ تسلی نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

(۹)

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہی سروِ چراغاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشیدِ عالم شبنمستاں کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے، خونِ گرمِ دہقاں کا

اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہی میرے درباں کا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مُردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کی زنداں کا

بغل میں غیر کی آپ آج سوئے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا؟ خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

(۱۰)

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

محبت تھی چمن سے، لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

(۱۱)

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

بقدرِ ظرف ہے ساقی، خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے، تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

۱۲

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز
میں، اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا، وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

ہیں بس کہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے، سر شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض، اس گرہِ نیم باز کا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ، کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

۱۳

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یارب! یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلّف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا

گو نہ سمجھوں اسکی باتیں گو نہ پاؤں اسکا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے، میری گور کے اندر کھلا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھُلا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم، ہے بلاؤں کا نزول
آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھُلا

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھُلا

اس کی امّت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھُلا

۱۴

شب، کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوّالہ، ہر اک حلقۂ گرداب تھا

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریے سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

واں، خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

جلوۂ گُل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

یاں سرِ پُر شور بے خوابی سے تھا دیوار جُو
واں، وہ فرقِ نازِ زیبِ بالشِ کمخواب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بےخودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

(۱۵)

نالۂ دل میں شب، اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بےتاب تھا

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی، کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ، وقفِ بسترِ سنجاب تھا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن، کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

۱۶

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر، ودیعتِ مژگانِ یار تھا

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرّہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

۱۷

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ از بس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظّارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تو ہو، اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

(۱۸)

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ، اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے
خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن
دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا

نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بہ باد
یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

(۱۹)

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا؟

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا؟

گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا! یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا
ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں، کھائیں گے کیا؟

(۲۰)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی، تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

(۲۱)

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

تجاہلِ پیشگی سے مدعا کیا
کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا، گلا کیا

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا

دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

سن اے غارت گرِ جنسِ وفا سن
شکستِ شیشۂ دل کی صدا کیا

کیا کس نے جگرداری کا دعویٰ
شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں
یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا

بلائے جاں ہے غالبؔ اسکی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

(۲۲)

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

کم نہیں نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں
تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا

نام کا میرے ہے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

ہر بُنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوں ناب
حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

(۲۳)

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

(۲۴)

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بے وفائی کا
بہ مُہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

زکاتِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر
رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی
عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

۲۵

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائیگا
بے تکلّف داغِ مہ مہرِ دہاں ہو جائے گا

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب
پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائیگا

لے تو لوں سوتے میں اسکے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائیگا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائیگا

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا

فائدہ کیا؟ سوچ، آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ
دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائیگا

(۲۶)

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب، کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما
کام گر رک گیا روانہ ہوا

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے
لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں — آج غالب غزل سرا نہ ہوا

(۲۷)

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہوں، کہ تو اور پاسخِ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ گل مت دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

ہنوز محرمیِ حسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بُنِ مُو کام چشمِ بینا کا

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدارِ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا
فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اسکو یاد اسد
جفا میں اسکی ہے اندازِ کارفرما کا

(۲۸)

قطرۂ مے، بس کہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا
اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ، لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

(۲۹)

جب، بہ تقریبِ سفر یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرے پہ اک دل باندھا
اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخئ ناز
جوہرِ آئینہ کو طوطئ بسمل باندھا

یاس و امید نے، یک عربدہ میداں مانگا
عجزِ ہمّت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

نہ بندھے تشنگیٔ ذوق کے مضموں غالبؔ
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

(۳۰)

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

(۳۱)

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر، گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

تنگیٔ دل کا گلہ کیا، یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

بعد یک عمر ورع، بار تو دیتا بارے
کاش، رضواں ہی در یار کا درباں ہوتا

(۳۲)

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

(۳۳)

یک ذرۂ زمیں نہیں بے کار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

بے مَے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی
کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

تازہ نہیں ہے، نشۂ فکرِ سخن مجھے
تریاکئِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں، کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار
یہ مے کدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

(۳۴)

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطئِ عنواں سمجھا

یک الف بیش نہیں، صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں، جب سے کہ گریباں سمجھا

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرمِ خرام
رخ پہ ہر قطرۂ عرق، دیدۂ حیراں سمجھا

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سائے کو میں اپنے شبستاں سمجھا

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا، اس قدر آساں سمجھا

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار، اسدؔ
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

(۳۵)

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سادگی ہائے تمنا یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل
نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں
دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

(۳۶)

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گراں باریِ زنجیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یوسف اس کو کہوں، اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا ولے طالبِ تاثیر بھی تھا

پیشے میں عیب نہیں رکھئے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی
آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

۳۷

لبِ خشک، در تشنگی مردگاں کا
زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا
ہمہ نا امیدی ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں، فریبِ وفا خوردگاں کا

۳۸

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا
توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
میں سادہ دل آزردگیٔ یار سے خوش ہوں
یعنی سبقِ شوقِ مکرّر نہ ہوا تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
جاری تھی اسدؔ داغ جگر سے مری تحصیل
آتش کدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

(۳۹)

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا
مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر یارب! ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا
حاصلِ اُلفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو
دل بہ دل پیوستہ گویا اک لبِ افسوس تھا
کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیان
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

(۴۰)

آئینہ دیکھ، اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
قاصد کی اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

(۴۱)

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا
بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

(۴۲)

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے، کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

ذرّہ ذرّہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں، بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرّہ صحرا دست گاہ و قطرہ دریا آشنا

ہیں، اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

شکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہ رہنا چاہیے
میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

کوہ کن، نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

(۴۳)

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

دے وہ جس قدر ذلّت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں انکو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا

گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
ننگ سجدہ سے میرے سنگ آستاں اپنا

تا کرے نہ غمّازی کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہمنے ہم زباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

۴۴

سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا

رخصت نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غم پنہاں میرا

(۴۵)

غافل بہ وہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ
صیدِ ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُر گُل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

جاں درہوائے یک نگۂ گرم ہے اسدؔ
پروانہ ہے وکیل ترے دادخواہ کا

(۴۶)

جور سے باز آئے پر، باز آئیں کیا
کہتے ہیں، ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ

جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ

یا رب! اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے

آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ

مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

۴۷

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ پارسائی کا

(۴۸)

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

ضعف سے گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس
کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

ب

۴۹

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب
دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے مگر
موج ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

جس قدر روح بناتی ہے جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

بس کہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال
ہے تصور میں ز بس جلوہ نما موجِ شراب

نشّے کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ
بس کہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

ایک عالم پہ ہیں طوفانیِ کیفیتِ فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گُل
رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشا موجِ شراب

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گُل دیکھ اسدؔ
پھر ہوا وقت، کہ ہو بال کشا موجِ شراب

ت

(۵۰)

افسوس، کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت

کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

(۵۱)

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت
جگر کو مرے عشق خوں نابہ مشرب
لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت
علی الرغم دشمن شہیدِ وفا ہوں
مبارک مبارک سلامت سلامت
نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

(۵۲)

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ
یار لائے مرے بالیں پہ اسے، پر کس وقت

(۵۳)

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد، جو بازارِ دوست
دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

خانہ ویراں سازیٔ حیرت تماشا کیجیے
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست

چشمِ مار روشن کہ اس بے درد کا دل شاد ہے
دیدۂ پُرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اسکے ہجر میں
بے تکلّف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست

تاکہ میں جانوں کہ ہے اسکی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ
سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیٔ گفتارِ دوست

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے
یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں غالبؔ زبس تکرارِ دوست

ج

(۵۴)

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل
سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

(۵۵)

لو ہم مریضِ عشق کے تیماردار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

چ

(۵۶)

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

کمالِ گرمیٔ سعیٔ تلاشِ دید نہ پوچھ
برنگِ خار مرے آئنے سے جوہر کھینچ

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل
کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

تری طرف ہے بہ حسرت نظارۂ نرگس
بکوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

بہ نیم غمزہ ادا کر حق ودیعت ناز
نیام پردۂ زخم جگر سے خنجر کھینچ
مرے قدح میں ہے صہبائے آتش پنہاں
بروئے سفرہ! کباب دلِ سمندر کھینچ

د

(۵۷)

حسن، غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد
منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیٔ انداز و ادا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد

درخورِ عرض نہیں، جوہرِ بیداد کو جا
نگہ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد

ہے جنوں، اہلِ جنوں کیلئے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بے کسئ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

ﮧ

(۵۸)

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار

نہیں ہے سایہ کہ سن کر نویدِ مقدمِ یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مئے جلوہ
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ
کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

وہ ارہا مرے ہمسائے میں تو سائے سے
ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار

نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

نہ پوچھ بےخودیٔ عیش مقدم سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار
نہ کہہ کسی سے کہ غالبؔ نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

۵۹

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر
کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن
جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر
کام اس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر
جی ہی میں کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالبؔ نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

(۶۰)

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے
سرگرم نالہ ہائے شرربار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو پر جوش رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذّتِ آزار دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زنّار باندھ، سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

٦١

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

فنا تعلیمِ درسِ بے خودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویش مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

نہیں اقلیم الفت میں کوئی طومار ناز ایسا
کہ پشت چشم سے جس کی نہ ہووے مہر عنواں پر

مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

بجز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاک شہیداں پر

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

٦٢

ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ابرو سے ہے کیا اس نگہِ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

دیتا نہ اگر دل تمہیں لیتا کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے انداز بیاں اور

۶۳

صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر
تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر
نہ کی سامان عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جام زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر

۶۴

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر
برنگ کاغذِ آتش زدہ نیرنگ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر
فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

۶۵

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف برطرف مل جائیگا تجھ سا رقیب آخر

۶۶

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائیگا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چاردہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی
بچّوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

نادان ہو جو کہتے ہو کیوں جیتے ہیں غالبؔ
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

ز

(۶۷)

فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و مہر
ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز

ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گل فروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز

مے خانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمیازہ کھینچے ہے بتِ بیدادفن ہنوز

(۶۸)

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نبردِ وہمِ وجود
ہنوز تیرے تصوّر میں ہے نشیب و فراز

وصالِ جلوہ تماشا ہے، پر دماغ کہاں
کہ دیجے آئنۂ انتظار کو پرداز

ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالبؔ
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

(۶۹)

کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

(۷۰)

وسعتِ سعیٔ کرم دیکھ کہ سرتاسرِ خاک
گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہربار ہنوز
یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقش پا میں ہے تپِ گرمیٔ رفتار ہنوز

(۷۱)

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز
لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز
ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے
ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

اے ترا جلوہ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم سر بسر انداز

تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو
ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز

اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

(۷۲)

مژدہ، اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی، قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

جگرِ تشنۂ آزار تسلّی نہ ہوا

جوئے خوں ہم نے بہائی بنِ ہر خار کے پاس

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

میں بھی رک رک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل
نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس

دیکھ کر تجھ کو چمن بس کہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

آتش

(۲۷)

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگا دے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

فروغ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

ع

(۷۴)

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

(۷۵)

رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیٔ شمع
ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیٔ شمع

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع

کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام
بہ طرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیٔ شمع

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیٔ شمع

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے
بہ جلوہ ریزیٔ باد و بہ پرفشانیٔ شمع

نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ
شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیٔ شمع

جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیٔ شمع

ف

(۷۶)

بیمِ رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش
مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیار حیف

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

ک

(۷۷)

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزہ ہوتا، اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہو جیو
نالۂ بلبل کا درد، اور خندۂ گل کا نمک

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحل ہے، بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ وا
یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیر درد
زخم مثل خندۂ قاتل ہے سرتاپا نمک

یاد ہیں غالبؔ تجھے وہ دن کہ وجد ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

۷۸

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

گ

۷۹

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ل

۸۰

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گُل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل

آزادیٔ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

خوش حال اس حریفِ سیہ مست کا کہ جو
رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بہ پائے گل

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار
میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

غالبؔ مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل

م

۸۱

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم
محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بت خانہ ہم
باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم
ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم
دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

(۸۲)

بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر

متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

(۸۳)

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور

رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا

رکھ لیجو میرے دعوئ وارستگی کی شرم

(۸۴)

لوں دام بخت خفتہ سے یک خواب خوش ولے

غالبؔ یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

(۸۵)

وہ فراق اور وہ وصال کہاں

وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے

ذوقِ نظّارۂ جمال کہاں

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خطّ و خال کہاں

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں

ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

(۸۶)

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں

ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

دل میں آجائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
خارِ رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائیگا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اس کی ہر بات پہ ہم نام خدا کہتے ہیں

وحشتؔ و شیفتہؔ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبؔ آشفتہ نوا کہتے ہیں

(۸۷)

آبرو کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگ پیراہن جو دامن میں نہیں

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

بس کہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

(۸۸)

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آ سکا
گر اک ادا ہو تو اسے اپنی قضا کہوں

حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوئے دل
ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں

میں، اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بیوفا کہوں

۸۹

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

۹۰

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ پوچھ

اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایکدن
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
نغمہ ہائے غم کو ہی اے دل غنیمت جانیئے
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن
دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایکدن

۹۱

ہم پر جفا سے ترک وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں
کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں
بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی

آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے
ہر چند پشتِ گرمیِ تاب و تواں نہیں

جاں مطربِ ترانۂ ھَل مِن مَزید ہے
لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

ہے ننگ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں
گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے سخن کی میں
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

جاں ہے بہائے بوسہ و لے کیوں کہے ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

۹۲

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکّر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہ دیدہ تصویر نہیں

حسرت لذت آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

رنج نومیدی جاوید گوارا رہیو
خوش ہوں گر نالہ زبونی کش تاثیر نہیں

سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے
لذت سنگ بہ اندازۂ تقریر نہیں

جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

(۹۳)

مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

(۹۴)

بر نشگالِ دیدۂ عاشق ہے دیکھا چاہیئے
کھل گئی مانندِ گُل سو جا سے دیوارِ چمن
الفتِ گُل سے غلط ہے دعویٔ وارستگی
سرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

(۹۵)

عشق تاثیر سے نومید نہیں
جاں سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے
جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیٔ جاوید نہیں
کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

(۹۶)

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
دل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں
ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

سراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے
کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

(۹۷)

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب انکی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے

جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

(۹۸)

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں

یہ سوءِ ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند

گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع

گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے

جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں

(۹۹)

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر، تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں
غالبؔ خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

(۱۰۰)

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں
وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق
مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں
شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں
حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی
عشقِ پر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

ظلم کر ظلم! اگر لطف دریغ آتا ہو

تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں

کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

صاف دردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ

وائے! وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ

میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

(۱۰۱)

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں

ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب

ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم

دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب

لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

وائے مظلومیٔ تسلیم! و بداحالِ وفا!

جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے

گر چراغانِ سرِ رہ گزرِ باد نہیں

سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں

مژدہ اے مرغ! کہ گلزار میں صیاد نہیں

نفی سے کرتی ہے اثبات طراوش گویا

دی ہی جائے دہن اسکو دمِ ایجاد نہیں

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت

یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ

تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں

(۱۰۲)

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں

(۱۰۳)

ہو گئی ہے غیر کی شیریں زبانی کارگر
عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

(۱۰۴)

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں!

دلِ نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالبؔ
نہ کر سرگرم اس کافر کو الفت آزمانے میں

(۱۰۵)

دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بے کسی کی پائی ہم نے دادیاں
ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہ گزارِ بادیاں

(۱۰۶)

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

(۱۰۷)

نہیں، کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں

شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے

بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں

جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں

کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب

گدائے کوچۂ مے خانہ نامراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام

دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

(۱۰۸)

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر
برق کو پابہ حنا باندھتے ہیں
قیدِ ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سروپا باندھتے ہیں
نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گُل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
سادہ پُرکار ہیں خوباں غالبؔ
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

(۱۰۹)

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

(۱۱۰)

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کیواسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرّد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لئے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

(۱۱۱)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوبؑ نے لی گو نہ یوسفؑ کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اسکی ہے، دماغ اسکا ہے، راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار

جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے

میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب

یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا

سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم

ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں

دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

۱۲۴

دیوانگی سے دوش پہ زنّار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بہ قدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

ڈر نالہ ہائے زار سے میرے خدا کو مان
آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

(۱۱۳)

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرے ہر قطرہ خوں تن میں

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

نکوہش مانعِ بے ربطیٔ شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

ہوئے اس مہر وش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پر افشاں جوہرِ آئینہ میں مثلِ ذرّہ روزن میں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

ہزاروں دل دیئے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

اسدؔ زندانیٔ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں
خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

(١١٤)

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں

مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گل رہ گزر میں خاک نہیں

بھلا اسے نہ سہی، کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
شراب خانہ کے دیوار و در میں خاک نہیں

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا، کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

(۱۱۵)

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں حرم نہیں، در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسن اور اس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں!

واں وہ غرورِ عزّ و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہوں دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

(۱۱۶)

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

"غیر سے رات کیا بنی" یہ جو کہا تو دیکھئے
سامنے آن بیٹھنا، اور یہ دیکھنا کہ یوں

بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھئے
اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی"
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

مجھ سے کہا جو یار نے "جاتے ہیں ہوش کس طرح"
دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ "یوں"
کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئنہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں
گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں
جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

و

(۱۱۷)

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو
بہ قدرِ حسرتِ دل چاہیئے ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

اگر وہ سروِ قد گرمِ خرامِ ناز آ جائے
کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

۱۱۸

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِّ صحبتِ اہلِ کنشت کو
طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو
آئی اگر بلا تو جگر سے ٹلی نہیں
ایرا ہی دے کے ہم نے بچایا ہی کشت کو
غالبؔ کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

(۱۱۹)

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بارِ نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

(۱۲۰)

قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا مرنا بُرا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خوں چکاں مژگانِ سوزن کو

خدا شرمائے ہاتھوں کو، کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

وفاداری بہ شرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانہ میں، تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویاں ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالبؔ
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

(۱۲۱)

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

دی سادگی سے جان، پڑوں کوہ کن کے پاؤں
ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

بھاگے تھے ہم بہت، سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر داہتے ہیں راہزن کے پاؤں

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤں

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پانو

غالبؔ مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

۱۲۲

واں اس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم کو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

۱۲۳

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صد رہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو
دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے
کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہم کو
ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن
تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو
جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو

یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو
رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں
نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو
سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم کو"
دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ و لیکن ناچار
پاسِ بے رونقیٔ دیدہ اہم ہے ہم کو
تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

قطعہ

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

۱۲۴

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو
کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں
مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو
ابھرا ہوا نقاب میں ہے انکے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست

لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

غالبؔ بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں

دنیا ہو یا رب! اور مرا بادشاہ ہو

(۱۲۵)

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو

کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیوں کر ہو

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال

کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے

حیا ہے اور یہی گومگو تو کیوں کر ہو

تمہیں کہو کہ گزارہ صنم پرستوں کا

بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ

جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیوں کر ہو

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلّی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیوں کر ہو

بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر ہو مجھ کو قرار
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیوں کر ہو

مجھے جنوں نہیں غالبؔ ولے بقولِ حضور
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

(۱۳۶)

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سر گراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی، کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ کہہ سکتے ہو "ہم دل میں نہیں ہیں" پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ "ہاں کیوں ہو"
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

(۱۲۷)

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ی

(۱۲۸)

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئنہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئنہ

۱۲۹

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اسکی خزاں پوچھ

ناچار بے کسی کی بھی حسرت اٹھائیے
دشواریِ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

ی

۱۳۰

صد جلوہ رو بہ رو ہے جو مژگاں اٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق
یعنی ہنوز منّتِ طفلاں اٹھائیے

دیوار بارِ منّتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے

(۱۳۱)

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

دے داد اے فلک! دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات چاہیے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوّری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

سر پائے خُم پہ چاہیے ہنگامِ بیخودی
رُو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیئے
نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیئے

(۱۳۴)

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی
رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنّا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی
نہ کرتا کاش نالہ، مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی
نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

مے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

(۱۳۲)

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیٔ صہبا
یک بار لگا دو خمِ مے میرے لبوں سے

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہونا طرفِ ان بے ادبوں سے

بے دادِ وفا دیکھ! کہ جاتی رہی آخر
ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

۱۳۴

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالبؔ ترا احوال سنا دیں گے ہم ان کو
وہ سن کے بلا لیں، یہ اجارا نہیں کرتے

۱۳۵

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

۱۳۶

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا، تقریب تیرے یاد آنے کی
کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب
قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی
لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے،
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اُٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی
ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی
لگد کوبِ حوادث کا تحمّل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی
کہوں کیا خوبیٔ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ
بدی کی اُس نے جس سے کی تھی ہم نے بارہا نیکی

۱۳۷

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

۱۳۸

کیا تنگ ہم ستمزدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پَرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

حالاں کہ ہے یہ سیلیٔ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گُمان ہے

کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

کیا خُوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چُپ رہو، ہمارے بھی مُنہ میں زبان ہے

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

ہے ہمارے اعتمادِ وفاداری اس قدر
غالبؔ ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے

۱۲۹

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے
کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے
گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اُٹھ گئی دُنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل تس پر یہ نا اُمیدواری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی الفت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

۱۴۰

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
ابتک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
کیجے بیاں سُرورِ تپِ غم کہاں تلک
ہر مُو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے
ہے وہ غرورِ حُسن سے بیگانۂ وفا
ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے
پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اِس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسؔد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

(۱۴۱)

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خُوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
کس کو سُناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ
دل فردِ جمع و خرجِ زباں ہائے لال ہے

کس پردے میں ہے آئنہ پرداز اے خدا
رحمت کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے
ہے ہے خُدا نخواستہ وہ، اور دُشمنی
اے شوقِ منفعل! یہ تجھے کیا خیال ہے
مُشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے
وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

(۱۴۲)

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے
دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

ہے وہی بدمستیِ ہر ذرّہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

مُجھ سے مت کہہ "تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھُل جاوے کہ اُس کو حسرتِ دیدار ہے

(۱۴۴)

بینس میں گزرتے ہیں جو کوچہ سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

(۱۴۵)

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنّا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

خزاں کیا، فصلِ گُل کہتے ہیں کسکو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریاد دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

نہ لائے شوخیٔ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہد تجدیدِ تمنّا ہے

(۱۴۶)

رحم کر ظالم، کہ کیا بود چراغ کُشتہ ہے
نبض بیمارِ وفا دُودِ چراغِ کُشتہ ہے

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی سُودِ چراغِ کُشتہ ہے

(۱۴۷)

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سُرمہ تو کہوے کہ دُودِ شعلۂ آواز ہے

پیکرِ عشاق، سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

دست گاہِ دیدۂ خوں بارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گُل فرشِ پا انداز ہے

۱۴۸

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رُسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دُشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ نا انصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

۱۴۹

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

ڈھونڈے ہے اس مُغنیِّ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مُدّعا مجھے

کرتا ہے بس کہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

کُھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

(۱۵۰)

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

(۱۵۱)

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہُوا کیے

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بِن صدا کیے

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے
مُدّت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہَوا کیے

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

مقدور ہو تو خاک سے پُوچھوں کہ او لئیم
تُو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدُو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خُو
دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کیے

ضد کی ہے اور بات مگر خُو بُری نہیں
بھُولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

غالبؔ تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے

(۱۵۲)

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے
مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے
بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے
زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے
جادادِ بادہ نوشیٔ رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے
نظّارہ کیا حریف ہو اس برقِ حُسن کا
جوشِ بہار، جلوے کو جس کے نقاب ہے
میں نامراد دل کی تسلّی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

گزرا اسدؔ مسرّتِ پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

۱۵۴

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

غیر کو یارب! وہ کیوں کر منعِ گستاخی کرے
گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جایئے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دُور چشمِ بد! تری بزمِ طرب سے واہ وا
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

اُس کی بزم آرائیاں سُن کر دلِ رنجور یاں
مثلِ نقشِ مدّعائے غیر بیٹھا جائے ہے

ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
رنگ کُھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

نقش کو اُس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

۱۵۴

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بَردِ لیالی نے مجھے

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمّتِ عالی نے مجھے

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
کر دیا کافر اِن اصنامِ خیالی نے مجھے

ہوسِ گُل کا تصوّر میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

۱۵۵

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے
غنچہ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلوم
باوجودِ دلجمعی، خوابِ گُل پریشاں ہے
ہم سے رنجِ بے تابی کس طرح اُٹھایا جائے
داغِ پشتِ دستِ عجز، شعلہ خس بہ دنداں ہے

۱۵۶

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

۱۵۷

سادگی پر اُس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے
بس ہجومِ نا اُمیدی خاک میں مِل جائے گی
یہ جو اک لذّت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے
رنجِ رہ کیوں کھینچیے واماندگی سے عشق ہے
اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے
جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گِل میں ہے
ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنّا پر، کہ کس مشکل میں ہے

(۱۵۸)

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا لذّتِ فراغ
تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظّارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی

(۱۵۹)

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

۱۶۰

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غمہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں
پر کچھ اَب کے سرگرانی اور ہے
دے کے خط مُنہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے
ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

۱۶۱

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اَب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی
کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

(۱۶۴)

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے؟
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزۂ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟
نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے!
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

۱۶۴

کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مُو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

ہو کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پُوچھنے کو آئے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بُو آئے

جلّاد سے ڈرتے ہیں، نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نا یافت
دیکھا کہ وہ مِلتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے
اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

(۱۶۴)

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز
پھر وہی پردۂ عماری ہے
چشمِ دلّالِ جنسِ رُسوائی
دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہی صد گونہ اشکباری ہے

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر
محشرستانِ بیقراری ہے

جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے
روز بازارِ جاں سپاری ہے

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

پھر کھلا ہے (ق) درِ عدالتِ ناز
گرم بازارِ فوجداری ہے

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
زُلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب
اشک باری کا حُکم جاری ہے

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اس کی روبکاری ہے
بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

(۱۶۵)

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذّت زندگانی کی
کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی
پس از مُردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تُربت پہ میری گل فشانی کی

(۱۶۶)

نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
اگر بووے بجائے دانہ دہقاں، نوکِ نشتر کی

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیٔ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

کروں بے دادِ ذوقِ پر فشانی عرض کیا قدرت
کہ طاقت اڑ گئی اُڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

کہاں تک روؤں اُس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

۱۵۷

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اُتنے ہی کم ہوئے

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانہ کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اللہ رے تیری تندیٔ خو جس کے بیم سے
اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اُٹھ گئے وہی اُن کے علم ہوئے

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی
مجھے اس سے کیا توقع، بہ زمانۂ جوانی
کبھی کودکی میں جس نے نہ سُنی مری کہانی
یُوں نہیں دُکھ کسی کو دینا نہیں خُوب، ورنہ کہتا
کہ مرے عدو کو یارب! ملے میری زندگانی

(۱۶۹)

ظُلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اِک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال، نہ نظارۂ جمال
مُدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
مے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق یاں اجازتِ تسلیم و ہوش ہے
گوہر کو عقدِ گردنِ خُوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

دیدارِ بادہ، حوصلۂ ساقی، نگاہِ مست
بزمِ خیال مے کدۂ بے خروش ہے

قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار! اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

۱۷۰

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلّی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی
خار، خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے
شوق، گلچینِ گلستانِ تسلّی نہ سہی
مے پرستاں خُمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی
نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی
نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی
عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالبؔ اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

(۱۷۱)

عجب نشاط سے جلّاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے
قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ اُلفت
فقط "خراب" لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے
غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذّتِ الم آگے
خُدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

بو عمر بھر جو پریشانیاں اُٹھائی ہیں ہم نے
تمہارے آئیو اے طرّہ ہائے خم بہ خم آگے

دل و جگر ہیں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دمِ آگے

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

(۱۶۴)

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ "جو کہیئے تو گلا ہوتا ہے"

پُر ہُوں میں شکوے سے یُوں، راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

گو سمجھتا نہیں پر حُسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سر گرمِ جفا ہوتا ہے

عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال
سُست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

خُوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھَلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اَب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

قطعہ

خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن
شاہ کی مدح میں یُوں نغمہ سرا ہوتا ہے

اے شہنشاہِ کواکب سپہ و مہرِ علم
تیرے اکرام کا حق کس سے اَدا ہوتا ہے

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
آستاں پہ ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

۱۷۴

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے"
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بد آموزیٔ عدو کیا ہے

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام و مشکبو کیا ہے

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس اُمید پہ کہیئے کہ آرزو کیا ہے

ہُوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

(۱۷۴)

میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیئے ہوتے

قہر ہو، یا بلا ہو، جو کچھ ہو
کاش کہ تم مرے لئے ہوتے
میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب! کئی دیئے ہوتے
آ ہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ
کوئی دن اور بھی جیئے ہوتے

۱۷۵

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بے دادِ انتظار نہیں ہے
دیتے ہیں جنت، حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے
گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو
ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے
ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر
خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

دل سے اُٹھا لُطفِ جلوہائے معانی
غیرِ گل آئینۂ بہار نہیں ہے
قتل کا میرے عہد تو کیا ہے بارے
وائے! اگر عہد استوار نہیں ہے
تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالبؔ
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

۱۷۹

ہجُومِ غم سے یاں تک سر نگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے
رفُوئے زخم سے مطلب ہے لذّت زخمِ سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے
وہ گُل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ
چٹکنا غنچۂ دل کا صدائے خندۂ دل ہے

پا بہ دامن ہو رہا ہوں، بس کہ میں صحرا نورد
خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے
دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے بعد
ہے نگاہِ آشنا تیرا سرِ ہر مُو مجھے
ہُوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پُوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تُو مجھے

(۱۷۸)

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے
سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے
تب نازِ گراں مائگیِ اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے
دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آئنہ گفتار میں آوے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیِ پُر خار میں آوے

مر جاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار میں آوے

عادت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

تب چاکِ گریباں کا مزا ہے دلِ نالاں
جب اِک نفس اُلجھا ہو ہر تار میں آوے

آتش کدہ ہے سینہ مِرا رازِ نہاں سے
اے وائے! اگر معرضِ اظہار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

۱۷۹

حُسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مُفت آئے تو مال اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھیے پاتے ہیں عشّاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے
خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

(۱۸۰)

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے
شاہ کی ہے غسلِ صحت کی خبر
دیکھئے دن کب پھریں حمّام کے
عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

۱۸۱

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطّۂ پاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے
چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی
کیوں نہ دُنیا کو ہو خوشی غالبؔ
شاہِ دیں دار نے شفا پائی

۱۸۴

تغافل دوست ہوں میرا دماغِ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے، تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالم اہلِ ہمّت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

۱۸۵

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پُوچھ
دیکھ خوں نابہ فشانی میری

کیا بیاں کرکے مرا روئیں گے یار
مگر آشفتہ بیانی میری

ہُوں زخود رفتۂ بیدائے خیال
بھُول جانا ہے نشانی میری

متقابل ہے مقابل میرا
رُک گیا، دیکھ روانی میری

قدرِ سنگ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرد بادِ رہِ بے تابی ہُوں
صرصرِ شوق ہے بانی میری

دہن اس کا جو نہ معلوم ہُوا
کھُل گئی ہیچ مدانی میری

کر دیا ضعف نے عاجز غالبؔ
ننگِ پیری ہے جوانی میری

۱۸۴

نقشِ نازِ بتِ طنّاز بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
تو وہ بدخو کہ تحیّر کو تماشا جانے
غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے
وہ تپِ عشق تمنّا ہے کہ پھر صورتِ شمع
شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

۱۸۵

گُلشن کو تری صحبت ازبس کہ پسند آئی ہے
ہر غنچے کا گُل ہونا آغوش کُشائی ہے
واں کنگرِ استغنا ہر دم ہے بلندی پر
یاں نالے کو اور اُلٹا دعوائے رسائی ہے

ازبس کہ سِکھاتا ہے غمِ ضبط کے انداز
جو داغ نظر آیا اِک چشم نمائی ہے

(۱۸۶)

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یا رب! اسے قسمت میں عدو کی
اچھا ہے سر انگشتِ حنائی کا تصوّر
دل میں نظر آتی تو ہے اِک بوند لہو کی
کیوں ڈرتے ہو عشّاق کی بے حوصلگی سے
یاں تو کوئی سُنتا نہیں فریاد کسو کی
دشنے نے کبھی مُنہ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی
صد حیف! وہ ناکام کہ اک عمر سے غالبؔ
حسرت میں رہے ایک بتِ عربدہ جو کی

سیمابِ پشتِ گرمیٔ آئینہ دے ہے ہم کو
حیراں کئے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے
آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب! چل کہ چلے دن بہار کے

(۱۸۴)

ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں
معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیئے
اس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیئے

(۱۸۵)

چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے
صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیئے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیئے
چاک مت کر جیب بے ایّامِ گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیئے
دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے
دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیئے
اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیئے
غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

(۱۸)

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

درسِ عنوانِ تماشا، بہ تغافل خوشتر
ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں
صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

غمِ عشّاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں
کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں
صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

بے خودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو
پُر ہے سائے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے
ہو نگہ مثلِ گلِ شمع پریشاں مجھ سے

بے کسی ہائے شبِ ہجر کی حسرت ہے ہے
سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے
گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھ سے
نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

(۱۹۱)

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جا
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں تو اُنہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بِن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بُلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بُجھائے نہ بنے

(۱۹۲)

چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عُریانی کرے
صبح کے مانند زخمِ دل گریبانی کرے

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال
دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک
آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

مے کدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پائے شکست
موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

خطِّ عارض سے لکھا ہے زُلف کو اُلفت نے عہد
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

۱۹۴

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

۱۹۴

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے
سرشک سر بہ صحرا دادہ نور العین دامن ہے
دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے
خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے
بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے
ابھی آتی ہے بو بالش سے اُس کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے
کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالبؔ
کہ بے تابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

(۱۹۵)

خطر ہے رشتۂ اُلفت رگِ گردن نہ ہو جائے
غرورِ دوستی آفت ہے تو دُشمن نہ ہو جائے
سمجھ اس فصل میں کوتاہیٔ نشو و نُما غالبؔ
اگر گُل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

(۱۹۶)

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے
کیوں بوتے ہیں باغباں تونبے
گر باغ گدائے مَے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تُو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ "ہے" نہیں ہے

شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے
اُردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے
کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد
مَے ہے یہ مگس کی قَے نہیں ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ
آخر تُو کیا ہے؟ اے "نہیں ہے"

۱۹۷

نہ پُوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے
بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اِک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

۱۹۸

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے ان کی تمنّا نہیں کرتے

در پردہ اُنھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے
یہ باعثِ نومیدیٔ اربابِ ہوس ہے
غالبؔ کو بُرا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

(۱۹۹)

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے
کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے
کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے
بجا ہے گر نہ سُنے نالہ ہائے بُلبلِ زار
کہ گوشِ گُل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے
اسدؔ ہے نزع میں، چل بے وفا برائے خدا
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل، کیوں نہ ہو
یعنی اس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

عارضِ گُل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

(۲۰۱)

دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے کیا کہیے
ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے کیا کہیے

یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بِن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

رہے ہے یُوں گہ و بے گہ کہ کوئے دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے

زہے کرشمہ کہ یُوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بِن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیے

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ سرِ رہ گذر ہے کیا کہیے

تمہیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا کہیے

انہیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیئے
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیے

حسد، سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے
ستم، بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

کہا ہے کس نے کہ غالبؔ بُرا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

۲۰۲

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن میری عُریانی مجھے

بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں
مرحبا میں، کیا مُبارک ہے گراں جانی مجھے

کیوں نہ ہو بے التفاتی اُسکی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسشہائے پنہانی مجھے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاش کے
اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

وائے! واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ وا
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزلخوانی مجھے

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

۲۰۲

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے
سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے

ہے کشادِ خاطرِ وابستہ دررہنِ سخن
تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانۂ مکتب مجھے

یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے
رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

۲۰۳

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

قد و گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کریں گے کوہ کن کے حوصلہ کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

نسیم مصر کو کیا پیر کنعاں کی ہوا خواہی
اسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبر اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

رہے ہے دل میں تیر اچھا، جگر کے پار ہو بہتر
غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

پڑا رہ اے دلِ وابستہ بیتابی سے کیا حاصل
مگر پھر تابِ زلفِ پرشکن کی آزمائش ہے

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے
وہ آئیں گے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالبؔ
نئے فتنوں میں اَب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

(۲۰۵)

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے
خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے
وہ بدخُو، اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے
اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر وہ ناتوانی ہے
نہ پُوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے
سنبھلنے دے مجھے اے نا اُمیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

تکلّف بر طرف، نظّارگی میں بھی سہی لیکن

وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالبؔ

وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

(۲۰۶)

زبس کہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے

کشاد و بستِ مژہ سیلیٔ ندامت ہے

نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بد عہدی

تجھے کہ آئنہ بھی ورطۂ ملامت ہے

بہ پیچ و تابِ ہوس سلکِ عافیت مت توڑ

نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد

جنونِ ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

(۲۰۷)

لاغر اتنا ہوں کہ گر تُو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمّہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

کیا تعجب ہے کہ اُس کو دیکھ کر آ جائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

مُنہ نہ دکھلا دے نہ دکھلا، پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زلف گر بن جاؤں تو شانے میں اُلجھا دے مجھے

(۲۰۸)

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اِک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اِک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا
کیوں کر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے"

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلا مرے آگے

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یُوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنّا مرے آگے

ہے موجزن اِک قلزمِ خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دَم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے

(٢٠٩)

ہوں جو حال تو کہتے ہو "مدعا کہیے"
نہیں کہو، کہ جو تم یُوں کہو تو کیا کہیے

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستمگر ہیں"
مُجھے تو خُو ہے کہ جو کچھ کہو "بجا" کہیے

وہ نیشتر سہی، پر دل میں جب اُتر جائے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہیے

جو مُدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے
جو نا سزا کہے اُس کو نہ نا سزا کہیے

کہیں حقیقتِ جاں کاہیٔ مرض لکھیے
کہیں مُصیبتِ ناسازیٔ دوا کہیے

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے
کہیں حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

نہیں نگار کو اُلفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیٔ روِش و مستیٔ ادا کہیے

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

(۲۱۰)

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے
صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ مے کشی
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے
رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے
کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے
پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے ان سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے
اس رنگ سے اُٹھائی کل اس نے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

۲۱۱

نشہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب
شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئے بارِ نغمہ ہے
ہم نشیں مت کہہ، کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

۲۱۲

عرضِ نازِ شوخیٔ دنداں برائے خندہ ہے
دعوائے جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے
ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل
یک جہاں زانو تامل درقفائے خندہ ہے

کلفتِ افسردگی کو عیشِ بے تابی حرام
ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے
سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

(۲۱۳)

حُسن بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
آئنہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
تاکجا، اے آگہی رنگِ تماشا باختن
چشمِ واگردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

(۲۱۴)

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طرۂ لیلا کرے کوئی

افسردگی نہیں طرب انشائے التفات
ہاں دردِ بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

رونے سے اے ندیم! ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ کہ جیب کو رُسوا کرے کوئی

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل
تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی

ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
تُو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست
نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

سر بر ہُوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عُمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنّا کرے کوئی

ہے وحشت طبیعت ایجاد یاس خیز
یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

بے کاری جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

(۲۱۵)

ابنِ مریم ہُوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو، گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

(۲۱۶)

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے

تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

کٹے تو شب کہیں کاٹے تو سانپ کہلاوے
کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے

لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود
کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے

نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا
خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے

وہ داد و دید گراں مایہ شرط ہے ہمدم
وگرنہ مہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

(۲۱۷)

باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

جوہرِ تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم
ہُوں میں وہ سبزہ کہ زہر آب اُگاتا ہے مجھے

مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے
آئنہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک
آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

(۲۱)

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی
اِترائے کیوں نہ خاک سرِ رہگزار کی

جب اس کے دیکھنے کے لئے آئیں بادشاہ
لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی

بھُوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے
کیوں کر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

(۲۱۹)

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دَم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہے گا اُس کی گردن پر
وہ خُوں جو چشمِ تر سے عُمر بھر یُوں دمبدم نکلے

نکلنا خُلد سے آدم کا سُنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھُل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہُوئی صبح، اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی اس دَور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

ذرا کر زور سینے پر کہ تیرِ پُر ستم نکلے
جو وہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اُٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

(۲۲۰)

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے
بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہو جائیے

بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

(۲۲۱)

مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے
موجِ شرابِ یک مژۂ خواب ناک ہے

جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو
جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ
صحرا ہماری آنکھ میں یک مشتِ خاک ہے

(۲۲۳)

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

(۲۲۴)

آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے
نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

بزمِ مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا
شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

۲۲۴

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنّا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آئے

۲۲۵

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شب ہائے ہجراں کی

۲۲۶

ہجومِ نالہ، حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے
خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے
"تکلّف برطرف" ہے جاں ستاں تر لطفِ بدخویاں
نگاہِ بے حجابِ ناز، تیغِ تیزِ عُریاں ہے
ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی
کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے
دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دست گرداں ہے

غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

۲۲۷

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے
نگاہِ دل سے تری سُرمہ سا نکلتی ہے
فشارِ تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے
نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ
کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

۲۲۸

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے
نافہ دماغ آہوئے دشتِ تتار ہے
کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ فرشِ ششش جہتِ انتظار ہے

ہے ذرہ ذرہ تنگیٔ جا سے غبارِ شوق
گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
نظارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے

چھڑکے ہے شبنم آئنۂ برگِ گل پر آب
اے عندلیب! وقت وداعِ بہار ہے

پچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

بے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرے کے نقاب میں دل بیقرار ہے

اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی
اے بے دماغ آئنہ تمثال دار ہے

غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

(۲۲۹)

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں

گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا

افسونِ انتظار، تمنّا کہیں جسے

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے

وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں

شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو

صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

غالبؔ بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

(۲۳۰)

شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے
داغِ دلِ بے دَرد نظرگاہِ حیا ہے

دل خُوں شدہ کشمکشِ حسرتِ دیدار
آئینہ بہ دستِ بتِ بدمستِ حنا ہے

شعلے سے نہ ہوتی، ہوسِ شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگیٔ دل پہ جلا ہے

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
آئینہ بہ اندازِ گل آغوش کشا ہے

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

خُو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو
معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

مجبوری و دعوائے گرفتاریِ اُلفت

دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گذشتہ

تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب اِدھر بھی

سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد

یارب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

بیگانگیِ خلق سے بے دل نہ ہو غالبؔ

کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

(۲۳۱)

منظور تھی یہ شکل، تجلّی کو نُور کی

قسمت کھلی ترے قد و رُخ سے ظہور کی

اِک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں

پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سُنی نہیں آوازِ صُور کی

آمد بہار کی ہے جو بُلبل ہے نغمہ سنج
اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیُور کی

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طُور کی

گرمی سہی کلام میں، لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

غالبؔ اگر سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

(۲۳۴)

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

نے تیر کماں میں ہے نہ صیّاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

کیا زھد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

ہے قہر کہ اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ

رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے

شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

(۲۲۴)

مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے

جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو

عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دَم

برسوں ہُوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفس

مدّت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق

سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بہ خونِ دل
سازِ چمن طرازیٔ داماں کیے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظّارۂ خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دل فریبیٔ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زُلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اِک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بارِ منّتِ درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

۲۳۴

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لیے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کیلئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

رہا بلا میں بھی مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے

فلک نہ دُور رکھ اس سے مُجھے کہ میں ہی نہیں
درازدستیٔ قاتل کے امتحاں کے لئے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

بہ قدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

نصیرِ دولت و دیں، اور معینِ ملّت و ملک
بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لئے

زمانہ عہد میں اُس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

وَرق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

ادائے خاص سے غالبؔ ہُوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

قصائد

(۱)

منقبت میں

سازِ یک ذرّہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار
سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

مستیٔ بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ
ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار

سبز ہے جامِ زمرّد کی طرح داغِ پلنگ
تازہ ہے ریشۂ نارنج صفتِ روئے شرار

مستیٔ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت
کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

کوہ و صحرا ہمہ معموریٔ شوقِ بُلبُل
راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

سو پئے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم
سرنوشتِ دو جہاں ابر بہ یک سطرِ غبار

کاٹ کر پھینکیے ناخن تو بہ اندازِ ہلال
قوّتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

کفِ ہر خاک بہ گردوں شدہ قمری پرواز
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤسِ شکار

مے کدہ میں ہو اگر آرزوئے گل چینی
بھول جا، یک قدحِ بادہ بہ طاقِ گلزار

موجِ گل ڈھونڈ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ
گم کرے گوشۂ مے خانہ میں گر تو دستار

کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر
سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار

لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیرِ سرا
چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور
رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

سبزۂ نُہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام
رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

واں کے خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ
وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عرفا
چشمِ نقشِ قدم آئینہ بختِ بیدار

ذرہ اس گرد کا، خورشید کو آئینہ ناز
گرد اس دشت کی اُمید کو احرامِ بہار

آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستئ ناز
عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ بہار

مطلعِ ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار
دلِ پروانہ چراغاں پرِ بلبل گلزار
شکلِ طاؤس کرے آئنہ خانہ پرواز
ذوق میں جلوے کے تیرے بہ ہوائے دیدار
تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں
سلکِ اختر میں مہِ نو مژہٴ گوہر بار
ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم مہرِ نماز
ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار
مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبی
جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار
جوہرِ دستِ دعا آئنہ یعنی تاثیر
یک طرف نازشِ مژگاں و دگر سو غمِ خار

مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبال نگاہ
خاکِ در کی تری جو چشم نہ ہو آئنہ دار

دُشمنِ آلِ نبی کو بہ طرب خانۂ دہر
عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار

دیدہ تا دل اسدؔ آئنۂ یک پرتوِ شوق
فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

(۲)

منقبت میں

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنّا کہ نہ دُنیا ہے نہ دیں

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم
لغو ہے آئنہ فرقِ جنون و تمکیں

نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں
لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دُنیا و چہ دیں
مثلِ مضمونِ وفا باد بہ دستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم خاک بہ فرقِ تمکیں
عشق بے ربطیٔ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل زنگارِ رخِ آئنۂ حُسنِ یقیں
کوہ کن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں آئنۂ خوابِ گرانِ شیریں
کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز
کس نے پایا اثرِ نالۂ دل ہائے حزیں
سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن
نہ سر و برگِ ستائش نہ دماغِ نفریں

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں

نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر
یا علی عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں

مظہرِ فیضِ خدا جان و دلِ ختمِ رسل
قبلۂ آلِ نبی کعبۂ ایجادِ یقیں

ہو وہ سرمایۂ ایجادِ جہاں گرمِ خرام
ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں

جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اس کا جس کا
وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں

نسبتِ نام سے اس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے
ابداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں

فیضِ خلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں

بُرشِ تیغ کا اُس کی ہے جہاں میں چرچا
قطع ہو جائے نہ سررشتۂ ایجاد کہیں
کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بُت خانۂ چیں
جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا
وصیٔ ختم رسل تو ہے بہ فتوائے یقیں
جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر
نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں
کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں
آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ
رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریل امیں
تیرے در کے لئے اسبابِ نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں

تیری مدحت کیلئے ہیں دل و جاں کام و زباں
تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں

کس سے ہو سکتی ہے مدّاحیِ ممدوحِ خدا
کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوس بریں

جنس بازار معاصی اسد اللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخ طلب
ہے ترے حوصلۂ فضل پر از بس کہ یقیں

دے دُعا کو مری وہ مرتبۂ حُسنِ قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں

غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

طبع کو اُلفتِ دُلدل میں یہ سرگرمیِ شوق
کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں

دلِ اُلفت نسب و سینۂ توحید فضا
نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں

صرفِ اعدا اثرِ شعلۂ دُودِ دوزخ
وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوس بریں

(۳)

شاہ ظفر کی مدح میں عید الفطر کے موقع پر لکھا گیا

ہاں مہِ نو سُنیں ہم اُس کا نام
جس کو تو جُھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صُبح
یہی انداز اور یہی اندام

بارے دو دن کہاں رہا غائب
بندہ عاجز ہے گردشِ ایّام

اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص!

حبّذا اے نشاطِ عامِ عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
ایک ہی ہے امید گاہِ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالبؔ اس کا مگر نہیں ہے غلام؟

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تُو
تب کہا ہے بہ طرزِ استفہام
مہرِ تاباں کو ہو تو ہو، اے ماہ
قربِ ہر روز بر سبیلِ دوام

ق

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا
جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام
جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون
مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام
میرا اپنا جُدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص
گر تجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِ فروغ
کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام؟
جب کہ چودہ منازلِ فلکی
کر چکی قطع تیری تیزیٔ گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر
کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا اک بلوریں جام
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیئے جاؤں
غم سے جب ہو گئی ہے زیست حرام

بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے
کہ نہ سمجھیں وہ لذّتِ دُشنام

کعبے میں جا بجائیں گے ناقوس
اب تو باندھا ہے دَیر میں احرام

اس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد
چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ جام

بوسہ دینے میں ان کو ہے انکار
دل کے لینے میں جن کو ہے ابرام

چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصّہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالبؔ اپنا نام

کہہ چکا میں تو سب کچھ، اب تُو کہہ
اے پری چہرہ! پیکِ تیز خرام

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن
نام شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہرِ ذوالجلال والاکرام
شہسوار طریقۂ انصاف
نوبہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز
جس کا ہر قول معنیٔ الہام
بزم میں میزبانِ قیصر و جم
رزم میں اوستادِ رستم و سام
اے ترا لطف زندگی افزا
اے ترا عہد فرخیِ فرجام

چشم بد دُور! خسروانہ شکوہ

تو حشں اللہ! عارفانہ کلام

جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم

جُرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام

وارثِ مُلک جانتے ہیں تجھے

ایرج و تور و خسرو و بہرام

زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے

گیو و گودرز و بیژن و رہام

مرحبا موشگافیٔ ناوک

آفریں آب داریٔ صمصام

تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف

تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام

ق

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند

برق کو دے رہا ہے کیا الزام

تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا

تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

ق

فنِ صورت گری میں تیرا گزر
گر نہ رکھتا ہو دستگاہ تمام
اس کے مضروب کے سر و تن سے
کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
صفحہ ہائے لیالی و ایّام
اور ان اوراق میں بہ کلکِ قضا
مجملاً مندرج ہوئے احکام
لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کُش
لکھ دیا عاشقوں کو دشمنِ کام
آسماں کو کہا گیا کہ کہیں
گنبدِ تیز گردِ نیلی فام
حکم ناطق لکھا گیا کہ لکھیں
خال کو دانہ اور زلف کو دام

آتش و آب و باد و خاک نے لی

وضعِ سوز و نم و رم و آرام

مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز

ماہِ تاباں کا اسم شحنۂ شام

تیری توقیعِ سلطنت کو بھی

دی بدستور صورتِ ارقام

کاتبِ حکم نے بموجب حکم

اس رقم کو دیا طرازِ دوام

ہے ازل سے روائیِ آغاز

ہو ابد تک رسائیِ انجام

(۴)

صبح دم دروازۂ خاور کھلا

مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا

خسروِ انجم کے آیا صرف میں

شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو رازِ مہ واختر کھُلا

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھُلا

سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو
موتیوں کا ہر طرف زیور کھُلا

صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اک نگارِ آتشیں رُخ، سر کھُلا

تھی نظر بندی کیا جب ردِّ سحر
بادۂ گل رنگ کا ساغر کھُلا

لا کے ساقی نے صبُوحی کے لیے
رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھُلا

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھُلا

تاجِ زرّیں مہرِ تاباں سے سوا
خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا

شاہ روشن دل بہادر شہ کہ ہے
رازِ ہستی اس پہ سر تا سر کھلا

وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں
مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے
عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام
اس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا

روشناسوں کی جہاں فہرست ہے
واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا

قطعہ

توسنِ شہ میں وہ خوبی ہے کہ جب
تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا

نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب
تو کہے بُت خانۂ آزر کُھلا
مُجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے
منصبِ مہر و مہ و محور کُھلا
لاکھ عُقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک
میری حدِ وسع سے باہر کُھلا
تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید
کس نے کھولا؟ کب کُھلا؟ کیونکر کُھلا؟
باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار
مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کُھلا
ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس
لوگ جانیں طبلۂ عنبر کُھلا

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں یُوں پَر کُھلا
کاش کے ہوتا قفس کا در کُھلا

ہم پکاریں اور کھلے، یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ
دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا

واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کماں
کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا

مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ
رہروی میں پردۂ رہبر کھلا

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک
آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

دیکھیو غالبؔ سے گر اُلجھا کوئی

ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھُلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال

پھر مہ و خورشید کا دفتر کھُلا

خامے نے پائی طبیعت سے مدد

بادباں کے اُٹھتے ہی لنگر کھُلا

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ

عرض سے یاں رُتبۂ جوہر کھُلا

مہر کانپا چرخ چکّر کھا گیا

بادشہ کا رایتِ لشکر کھُلا

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب

اب علوئے پایۂ منبر کھُلا

سکّۂ شہ کا ہوا ہے روشناس

اب عیارِ آبروئے زر کھُلا

شاہ کے آگے دھرا ہے آئنہ
اب مآلِ سعیِ اسکندر کھُلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے
اب فریبِ طغرل و سنجر کھُلا
ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے
دفترِ مدحِ جہاں داور کھُلا
فکر اچھّی پر ستائش نا تمام
عجزِ اعجازِ ستائش گر کھُلا
جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل
تم پہ اے خاقانِ نام آور کھُلا
تم کرو صاحب قرانی جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھُلا

مثنوی

آموں کی تعریف

ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز
کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز
خامے کا صفحہ پر رواں ہونا
شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے "کیا لکھیے"
نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں ہے؟
ثمر و شاخ، گوے و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں
آئے یہ گوے اور یہ میداں

آم کے آگے پیش جائے خاک
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور
بادۂ ناب بن گیا انگور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے
شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے
آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ و بار
جب خزاں ہو تب آئے اس کی بہار
اور دوڑائیے قیاس کہاں
جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی
کوہکن باوجودِ غمگینی !

جان دینے میں اس کو یکتا جان
پر وہ یُوں سہل دے نہ سکتا جان
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر
کہ دوا خانۂ ازل میں مگر
آتشِ گُل پہ قند کا ہے قوام
شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام
یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے
باغبانوں نے باغِ جنت سے
انگبیں کے بحکمِ ربُّ النّاس
بھر کے بھیجے ہیں سر بمُہر گلاس
یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات
مدّتوں تک دیا ہے آبِ حیات
تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل
ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل

تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس
رنگ کا زرد، پر کہاں بُو باس
آم کو دیکھتا اگر اک بار
پھینک دیتا طلائے دست افشار
رونقِ کارگاہ برگ و نوا
نازشِ دودمانِ آب و ہوا
رہروِ راہِ خلد کا توشہ
طُوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ
صاحبِ شاخ برگ و بار ہے آم
ناز پروردۂ بہار ہے آم
خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو
نوبرِ نخلِ باغِ سلطاں ہو
وہ کہ ہے والیٔ ولایت عہد
عدل سے اُس کے ہے حمایتِ عہد

فخرِ دیں عزِ شان و جاہ و جلال
زینتِ طینت و جمالِ کمال

کار فرمائے دین و دولت و بخت
چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

سایہ اس کا ہما کا سایہ ہے
خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے

اے مُفیضِ وجودِ سایہ و نور
جب تلک ہے نمُودِ سایہ و نور

اس خداوندِ بندہ پرور کو
وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دل شاد و شادماں رکھیو
اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو

قطعات

(۱)

اے شہنشاہِ فلک منظر، بے مثل و نظیر
اے جہاں دارِ کرم شیوہ، بے شبہ و عدیل
پاؤں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل
تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل
تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل
بہ سخن اوجِ دہِ مرتبۂ معنی و لفظ
بکرم (-) داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل
تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توقیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا حُوت سے کرنا تحویل
تیری دانش میری اصلاحِ مفاسد کی رہین
تیری بخشش مری انجاحِ مقاصد کی کفیل
تیرا اقبال ترحم مرے جینے کی نوید
تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل
بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل
پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل
تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل
دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا[۱] کی داڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ عمرو[۲] کی زنبیل

۱، ۲ لقا اور عمرو بن اُمیہ داستانِ امیر حمزہ کے دو مشہور کردار ہیں۔

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدّق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل
نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل
قبلۂ کون و مکاں! خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں! عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

(۲)

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے
بس، اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو مل جاؤ
قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں "کیوں ہم نہ کہتے تھے"

(۳)

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اِک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزا زار ہائے مطرّا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ وا
وہ بادہ ہائے ناب و گوارا کہ ہائے ہائے

(۴)

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اُسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے
مہر مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے
حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے

کیوں اسے گوہرِ نایاب تصوّر کیجے
کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے
کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلا لکھیے
کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلما کہیے
اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے
مسّی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے
داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے
سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے
خالِ مشکینِ رُخِ دل کشِ لیلا کہیے
حجرالاسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض
نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے

وضع میں اس کو اگر جانیئے قافِ تریاق
رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیئے

صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مہرِ نماز
مے کدے میں اسے خشتِ خُمِ صہبا کہیئے

کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیئے
کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنّا کہیئے

(۵)

نہ پُوچھ اس کی حقیقت حضورِ والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خُلد سے باہر
جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

(۶) سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حُسنِ دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کُلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دُولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہُر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیئے پھولوں کا بھی ایک مقرّر سہرا

جب کہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رُخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گرانباریِ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا

(۷)

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ؟ ہاں اس سے مدّعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آپڑی ہے سُخن گسترانہ بات
مقصُود اس سے قطع محبت نہیں مجھے
رُوئے سُخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں
ہے شُکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہُوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

(۸)

نصرت الملک بہادر! مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے
گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
رونق بزم مہ و مہر تری ذات سے ہے
اور مَیں وہ ہُوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سرِ دست
نسبت اک گُونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے
ہاتھ میں تیرے رہے توسن دولت کی عناں
یہ دُعا شام و سحر قاضی حاجات سے ہے

تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار
غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

(۹)

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشک بو کی ناند

جو آئے جام بھر کے پئے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زر و مہر و ماہ ماند

یوں سمجھئے کہ بیچ سے خالی کئے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

غالب یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت و خواند

(۱۰)

اے شاہِ جہاں گیر، جہاں بخش، جہاندار

ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو

تو وا کرے اس عقدے کو سو بھی بہ اشارت

ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر؟

گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا

ہے فخرِ سلیماں جو کرے تیری وزارت

ہے نقشِ مریدی ترا فرمانِ الٰہی

ہے داغِ غلامی ترا توقیعِ امارت

تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں

تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت

ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی

باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغّل

ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

کیوں کر نہ کروں مدح کو میں ختم دُعا پر

قاصر ہے ستائش میں تری میری عبارت

نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں

نظارگیٔ صنعتِ حق اہلِ بصارت

تجھ کو شرفِ مہرِ جہاں تاب مبارک

غالبؔ کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

(۱۱)

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو

اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو

روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

(۱۲)

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ
اے جہاں دارِ آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں
تھا میں اک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی
ہوئی میری وہ گرمیٔ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرّۂ ناچیز
روشناسِ ثوابت و سیّار
گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری
ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں
بادشہ کا غلامِ کار گزار

خانہ زاد اور مرید اور مداح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شُکر
نسبتیں ہو گئیں مشخص چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں
مدّعائے ضروری الاظہار
پیر و مرشد! اگرچہ مُجھ کو نہیں
ذوقِ آرائشِ سر و دستار
کُچھ تو جاڑے میں چاہیئے آخر
تا نہ دے بادِ زمہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش
جسم رکھتا ہُوں ہے اگرچہ نزار
کُچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دُھوپ

بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انساں
دُھوپ کھائے کہاں تلک جاندار؟
دُھوپ کی تابش، آگ کی گرمی
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

میری تنخواہ جو مقرر ہے
اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مُردے کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مُجھ کو دیکھو تو ہُوں بقیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بس کہ لیتا ہُوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سُود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار
رزم کی داستاں اگر سُنیئے
ہے زُباں میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے
ہے قلم میرا ابر گوہر بار
ظُلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

ختم کرتا ہوں اب دُعا پہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(۱۳)

سہہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسّر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے

(۱۴)

سہل تھا مسہل، ولے یہ سخت مشکل آ پڑی
مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل تین تبریدیں، یہ سب کے دن ہوئے

(۱۵)

خجستہ انجمن طوئے میرزا جعفر
کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالب
نہ کیوں ہو مادۂ سالِ عیسوی "محظوظ"
۱۸۵۴ء

(۱۶)

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی
ہُوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
کہا غالب سے تاریخ اس کی کیا ہے؟
تو بولا "انشراحِ جشنِ جمشید"
۱۲۷۰ھ

(۱۷)

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہُوئے کرتے ہیں سلام
اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

رباعیات

(١)

بعد از تمامِ بزمِ عیدِ اطفال
ایامِ جوانی رہے ساغر کشِ حال
آپہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم
اے عمرِ گذشتہ یک قدم استقبال

(۲)

شب زلف و رخ عرق فشاں کا غم تھا
کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک
ہر قطرۂ اشک دیدۂ پرنم تھا

(۳)

آتش بازی ہے جیسے شغل اطفال
ہے سوز جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجد عشق بھی قیامت کوئی
لڑکوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکال

(۴)

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی
بے تابیٔ رشک و حسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن اے تجلی! افسوس
تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

(۵)

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لئے
وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لئے
یعنی ہر بار صورتِ کاغذِ باد
ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لئے

(۶)

دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا
اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں
غالبؔ منہ بند ہو گیا ہے گویا

(۷)

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ
دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

(۸)

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل!
سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل!
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مُشکل وگرنہ گویم مُشکل!

(۹)

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جم جاہ نے دال
ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

(۱۰)

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم
آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم
ہے ابکے شبِ قدر و دوالی باہم

(۱۱)

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے
تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ
ہے صفر کہ افزائشِ اعداد کرے

(۱۲)

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا
اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سیکڑہ کو ایک گرہ فرض کریں
ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

(۱۳)

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں
عشّاق کی پرسش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا
کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

(۱۴)

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ!
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

(۱۵)

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن
خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

(١٦)

ان سیموں کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہِ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

(١٧)

رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے
ثاقب حرکت یہ کی ہے بیجا تم نے
حاجی کلو کو دے کے بے وجہ جواب
غالب کا بگاڑ دیا کلیجہ تم نے

(۱۸)

اے روشنی دیدہ شہاب الدین خاں
کٹتا ہے بتاؤ کس طرح سے رمضاں
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک
سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں!

وہ اشعار اور قطعات جو دواوین مرّجہ میں نہیں ہیں

قصیدہ

(۱)

مرحبا سالِ فرّخی آئیں — عیدِ شوال و ماہِ فروردین
شب و روز افتخارِ لیل و نہار — مہ و سال اشرفِ شہور و سنین
گرچہ ہے بعد عید کے نوروز — ایک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں
سو اس اکیس (۲۱) دن میں ہولی کی — جا بجا مجلسیں ہوئیں رنگیں
شہر میں کو بہ کو عبیر و گلال — باغ میں سو بسو گل و نسرین
شہر گویا نمونۂ گلزار — باغ گویا نگارخانۂ چیں
تین تیوہار اور ایسے خوب — جمع ہرگز ہوئے نہ ہونگے کہیں
پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں — منعقد محفلِ نشاط قریں
محفلِ غسلِ صحتِ نوّاب — رونق افزائے مسندِ تمکیں
بزم گہ میں امیر شاہ نشان — رزم گہ میں حریف شیر کمیں

پیش گاہِ حضور شوکت و جاہ — خیر خواہِ جناب دولت و دیں
جن کی مسند کا آسماں گوشہ — جن کی خاتم کا آفتاب نگیں
جن کی دیوار قصر کے نیچے — آسماں ہے گدائے سایہ نشیں
دہر میں اس طرح کی بزم سرور — نہ ہوئی ہو کبھی بروئے زمیں
انجم چرخ گوہر آگیں فرش — نورِ بے ماہ ساغرِ سیمیں
راجہ اندر کا جو اکھاڑا ہے — ہے وہ بالائے سطح چرخ بریں
وہ نظر گاہِ اہلِ وہم و خیال — یہ ضیا بخش چشم اہلِ یقیں
واں کہاں یہ عطا و بذل و کرم — کہ جہاں گدیہ گر کا نام نہیں
یاں زمیں پر نظر جہاں تک جائے — ژالہ آسا بچھے ہیں درِ ثمیں
نغمۂ مطربانِ زہرہ نوا — جلوۂ لولیانِ ماہ جبیں
اس اکھاڑے میں جو کہ ہے منظور — یاں وہ دیکھا بچشمِ صورت بیں
سرورِ مہر فر ہوا جو سوار — بہ کمالِ تجمل و تزئیں
سب نے جانا کہ ہے پری توسن — ابر بالِ پری ہے دامنِ زیں
نقش سمِ سمند سے یکسر — بن گیا دشت دامنِ گلچیں
فوج کی گرد راہ مشک فشاں — رہ رووں کے مشام عطر آگیں

بس کہ بخشی ہے فوج کو عزت
فوج کا ہر پیادہ ہے فرزیں

موکبِ خاص یوں زمیں پر تھا
جس طرح ہے سپہر پر پرویں

چھوڑ دینا تھا گور کو بہرام
ران پر داغ تازہ دے کے ہیں

اور داغ آپ کی غلامی کا
خاص بہرام کا ہے زیبِ سریں

بندہ پرور ثناطرازی سے
مدعا وضعِ فنِ شعر نہیں

آپ کی مدح اور میرا منہ
گر کہوں بھی تو آئے کس کو یقیں

اور پھر اب کہ ضعفِ پیری سے
ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں

پیری و نیستی خدا کی پناہ
دستِ خالی و خاطرِ غمگیں

صرف اظہار ہے ارادت کا
ہے قلم کو جو سجدہ ریز جبیں

مدح گستر نہیں دعا گو ہے
غالبِ عاجزِ نیاز آگیں

ہے دعا بھی یہی کہ دنیا میں
تم رہو زندہ جاوداں آمیں

قطعہ

(۲)

ایک اہلِ درد نے سنسان جو دیکھا قفس
یوں کہا "آتی نہیں اب کیوں صدائے عندلیب
بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیّاد نے
یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب

۳

اُٹھا اِک دن بگولا سا جو کچھ میں جوشِ وحشت میں
پھرا سرگشتہ گھبرا گیا تھا جی بیاباں سے
نظر آیا مجھے اِک طائرِ مجروح پر بستہ
ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے
کہا میں نے کہ "او گمنام! آخر ماجرا کیا ہے
پڑا ہے کام تجھ کو کس ستمگر آفتِ جاں سے

ہنسا کچھ کِھلکھلا کر پہلے، پھر مجھ کو جو پہچانا
تو یہ رویا کہ جوئے خوں بہی پلکوں کے داماں سے
کہا میں صید ہوں اس کا کہ جس کے دام گیسو میں
پھنسا کرتے ہیں طائر روز آ کر باغِ رضواں سے
اسی کی زلف و رخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھ کو
نہ مطلب کفر سے ہے اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے"
بچشمِ غور جو دیکھا مرا ہی طائرِ دل تھا
کہ جل کر ہو گیا یوں خاک میری آہِ سوزاں سے

قطعہ تاریخ

(۴)

اس کتابِ طرب نصاب نے جب
آب و تاب انطباع کی پائی
فکرِ تاریخِ سال میں مجھ کو
ایک صورت نئی نظر آئی

ہندسے پہلے سات سات کے دو
دے گئے ناگاہ مجھ کو دکھلائی
اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا
با ہزاراں ہزار زیبائی
سالِ ہجری تو ہو گیا معلوم
بے شمولِ عبارت آرائی
مگر اب ذوقِ بذلہ سنجی کو
ہے جداگانہ کار فرمائی
سات اور سات ہوتے ہیں چودہ
بہ اُمیدِ سعادت افزائی
غرض اس سے ہیں چاردہ معصوم
جن سے ہے چشم و جاں کو زیبائی
اور بارہ امام ہیں بارہ
جن سے ایماں کو ہے توانائی

اُن کو غالبؔ یہ سال اچھا ہے
جو ائمہ کے ہیں توّلائی

غزل

(۵)

شبِ وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ
ہُوا ہے موجبِ آرامِ جان و تن تکیہ
خراج بادشہِ چین سے کیوں نہ مانگوں آج
کہ بن گیا ہے خمِ جعدِ پُرشکن تکیہ
بنا ہے تختۂ گل ہائے یاسمیں بستر
ہُوا ہے دستۂ نسرین و نسترن تکیہ
فروغِ حسن سے روشن ہے خوابگاہ تمام
جو رختِ خواب ہے پرویں تو ہے پرن تکیہ
مزا ملے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا
رکھے جو بیچ میں وہ شوخ سیم تن تکیہ

اگرچہ تھا یہ ارادہ مگر خدا کا شکر
اُٹھا سکا نہ نزاکت سے گُل بدن تکیہ
ہُوا ہے کاٹ کے چادر کو ناگہاں غائب
اگرچہ زانوئے نل پر رکھے دمن تکیہ
بضرب تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہُوا
کہ ضرب تیشہ پہ رکھتا تھا کوہکن تکیہ
یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ صُبح ہونے تک
رکھو نہ شمع پر اے اہلِ انجمن تکیہ
اگرچہ پھینک دیا تم نے دُور سے لیکن
اُٹھائے کیونکہ یہ رنجورِ خستہ تن تکیہ
غش آگیا جو پس از قتل میرے قاتل کو
ہوئی ہے اس کو مری نعشِ بے کفن تکیہ
شبِ فراق میں یہ حال ہے اذیت کا
کہ سانپ فرش ہے اور سانپ کا ہے مَن تکیہ

روا رکھو، رکھو، تھا جو لفظ تکیہ کلام

اَب اس کو کہتے ہیں اہلِ سخن سخن تکیہ

ہم اور تم فلکِ پیر جس کو کہتے ہیں

فقیرِ غالبِ مسکیں کا ہے کہن تکیہ

(۶)

جس دن سے کہ ہم خستہ گرفتارِ بلا ہیں

کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

(۷)

میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی

تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی

غیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غیرتِ ماہ

ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہی

تم ہو بُت پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے

تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

حُسن میں حُور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی
آپ کا شیوۂ انداز و ادا اور سہی

تیرے کوچہ کا ہے مائل دلِ مضطر میرا
کعبہ اک اور سہی قبلہ نما اور سہی

کوئی دُنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ
خُلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

مُجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
زہر کچھ اور سہی آبِ بقا اور سہی

مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

(۸۰)

بس کہ فعالِ ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کئے شکوہ
سوزش داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کئے باہم
ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے داغ دل سے ہجراں کا

(۹)

بہ رہنِ شرم ہے باوصفِ شوخی اہتمام اس کا
نگیں میں جوں شرارِ سنگ ناپیدا ہے نام اس کا
مِسی آلودہ ہے مُہر نوازش نامہ ظاہر ہے
کہ داغِ آرزوئے بوسہ دیتا ہے پیام اس کا
بامید نگاہِ خاص ہوں محمل کشِ حسرت
مبادا ہو عناں گیر تغافل لُطفِ عام اس کا

(۱۰)

شب کہ ذوقِ گفتگو سے تیرے دل بیتاب تھا
شوخیٔ وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا
واں ہجومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسدؔ
ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا

(۱۱)

دود کو آج اس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی
وہ دلِ سوزاں کہ کل تک شمعِ ماتم خانہ تھا

شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا
غالبؔ ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

(۱۲)

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

(۱۳)

معزولیِ تپش ہوئی افرازِ انتظار
چشمِ کشودہ حلقۂ بیرونِ در ہے آج

(۱۴)

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

(۱۵)

مے کشی کو نہ سمجھ بے حاصل
بادۂ غالبؔ عرقِ بید نہیں

(۱۶)

ہے نزاکت بس کہ فصلِ گُل میں معمارِ چمن
قالبِ گُل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن

(۱۷)

ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں
خارِ الم سے پُشت بہ دنداں گزیدہ ہُوں
ہوں گرمیٔ نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہُوں

(۱۸)

ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو
برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

(۱۹)

ہندوستان سایۂ گُل پائے تخت تھا
جاہ و جلال عہدِ وصالِ بتاں نہ پُوچھ
ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے
عرضِ فضائے سینۂ دردِ امتحاں نہ پُوچھ
کہتا تھا کل وہ محرمِ راز اپنے سے کہ ہاں
دردِ جُدائی اسد اللہ خاں نہ پُوچھ

(۲۰)

دیدہ خونبار ہے مدّت سے و لے آج ندیم
دِل کے ٹکڑے بھی کئی خُون کے شامِل آئے

اب ہے دلّی کی طرف کوچ ہمارا غالبؔ
آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل آئے

(۲۱)

ہجومِ ریزشِ خوں کے سبب رنگ اڑ نہیں سکتا
حنائے پنجۂ صیّاد مرغِ رشتہ بر پا ہے

(۲۲)

غالبؔ ز بس کہ سوکھ گئے چشم میں سرشک
آنسو کی بوند گوہرِ نایاب ہو گئی

(۲۳)

بہا ہے یاں تک اشکوں میں غبارِ کلفتِ خاطر
کہ چشمِ تر میں ہر اک پارۂ دل پائے در گِل ہے

(۲۴)

کمالِ حُسن اگر موقُوفِ اندازِ تغافل ہو
تکلّف برطرف تُجھ سے تری تصویر بہتر ہے

(۲۵)

حیراں ہُوں شوخیٔ رگِ یاقوت دیکھ کر
یاں ہے کہ صحبتِ خس و آتش برابر ہے

(۲۶)

چند تصویرِ بُتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نِکلا